

عصری تہذیبی کشمکش میں بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے ڈاکٹر محمد اکرم وِ رِک

اربابِ دانش سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ گلوبلائزیشن (Globalization) کے اس دور میں بین المذاہب مکالمہ (Inter-Faith Dialogue) کی ضرورت و اہمیت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ باہمی مکالمہ ہی وہ واحد آپشن ہے جس سے کسی بھی مذہب کا داعی مخاطب کو اپنی دعوت کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ باہمی مکالمہ دعوت کا ایک ایسا اسلوب ہے جس کے ذریعے مخاطب کو زیادہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ گفتگو کا یہ ایسا اسلوب ہے جس میں متکلم اور سامع کے درمیان براہِ راست گفتگو ہوتی ہے اور حقائق پوری طرح نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ پھر یا تو مخاطب مدِّ مقابل کے موقف کو قبول کر لیتا ہے یا اسے دلائل کی بنیاد پر رد کر دیتا ہے۔ یہ مکالمہ افراد کے درمیان بھی ہو سکتا ہے اور مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان بھی۔

بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت

بہ حیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپ کی امت آخری امت ہے۔ اس لیے دنیا کے تمام انسانوں تک پیغامِ الہی پہنچانا ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔ قرآن و حدیث کے متعدد نصوص سے واضح طور پر امت محمدیہ ﷺ پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ مختلف ممالک کے حکمرانوں کے نام رسول اللہ ﷺ کے دعوتی و تبلیغی خطوط جہاں معاصر مذاہب اور تہذیبوں سے آپ کے مکالمہ کی ایک خوب صورت مثال ہیں، وہیں یہ خطوط اس بات کی

بھی دلیل ہیں کہ اسلام اصلاً دین دعوت ہے اور اس کی دعوت کا دائرہ کار تمام عالم کو محیط ہے، اس لیے اس کے عالمی پیغام کو دوسروں تک پہنچانا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ مذاہب عالم میں اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے نہ صرف عالم گیر سطح پر دعوت و تبلیغ کا حکم دیا ہے، بلکہ دوسری تہذیبوں، قوموں اور افراد کے ساتھ گفتگو اور مکالمے کے باقاعدہ اصول بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. (النحل: ۱۲۵)

آپؐ لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیے اور ان کے ساتھ پسندیدہ طریقہ سے بحث کیجئے۔

اسلام کی یہ ایک ایسی انفرادیت ہے جو اسے تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ھ) لکھتے ہیں:

”یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو سچائی قبول کرنے کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو الہامی اور تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے، لیکن صحیفہ محمدی ﷺ نے نہایت اختصار، لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا کہ پیغام الہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔“

مذاہب عالم میں عملی طور پر صرف عیسائیت اور اسلام ہی تبلیغی مذاہب ہیں، دیگر تمام مذاہب کا دائرہ کار کسی خاص علاقے یا نسل تک محدود ہے، جبکہ عیسائیت کی عالم گیر دعوت اور اشاعت بھی حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے منافی ہے، کیوں کہ ان کی بعثت خاص بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کا بیان ہے:

”میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا“ (انجیل متی، ۱۵: ۲۴)

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب بارہ نقیب مقرر فرمائے اور ان کو مختلف علاقوں کی طرف دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ کیا تو بطور خاص ان کو تلقین فرمائی:

”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔“

(انجیل مٹی، ۶:۱۰)

الغرض یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے اپنے پیروکاروں کو نہ صرف دین اسلام کی ترویج و اشاعت کا حکم دیا ہے، بلکہ دیگر مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ مکالمے کے بنیادی اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے۔ داعی اعظم ﷺ نے مختلف اقوام اور تہذیبوں کے ساتھ جو مکالمہ فرمایا، سیرت طیبہ سے اس کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ آپؐ نے ایک طرف عرب کی مشرکانہ تہذیب کے نمائندہ افراد، سردارانِ قریش اور ان کے وفود سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ کیا اور دوسری طرف ورقہ بن نوفل سے لے کر نجران کے عیسائی علماء سے آپؐ کا مکالمہ گویا عیسائیت سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ تھا۔ اسی طرح مدنی دور کے اوائل میں بیشاق مدینہ، جس کے بڑے فریق یہودی قبائل تھے، یہود سے مکالمہ ہی کی ایک صورت تھی۔

بین المذاہب مکالمے کا بنیادی اصول۔ ہم زبانی

آں حضرت ﷺ نے مختلف صحابہ کرام کو دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا، کیوں کہ دعوت و تبلیغ اور باہمی مکالمہ میں تاثیر اور قوت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب پیغام کی زبان آسان، نرم اور قابل فہم ہو۔ ہم زبانی سے اُنسیت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہو جاتی ہے اور گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ) کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا، تاکہ یہود سے انہی کی زبان میں گفتگو کی جاسکے اور انہی کی زبان میں ان کے خطوط کا جواب دیا جاسکے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے:

پس میں نے ان کی زبان میں لکھنا سیکھ لیا۔
ابھی پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ میں اس
میں ماہر ہو گیا۔ جب یہودی کوئی خط آپ کو
لکھتے تو میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتا اور اگر
آپ کو جواب لکھنا ہوتا تو وہ میں لکھ دیتا۔

فتعلّمت کتابہم، مامرت بی خمس
عشرة ليلة حتى حذقته و كنت أقرأ
له كتبهم اذا كتبوا اليه وأجيب عنه
اذا كتب. ۲

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک ایرانی عورت حضرت ابو ہریرہؓ
(م ۵۸ھ) کی خدمت میں استعاضہ لے کر آئی کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی
ہے اور اب مجھ سے میرا بیٹا بھی چھیننا چاہتا ہے۔ اس عورت نے یہ ساری گفتگو فارسی
زبان میں کی اور ابو ہریرہؓ نے بھی اس سے اسی زبان میں گفتگو کی، پھر آپ نے بچہ عورت
کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ ۳

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام نے دوسری قوموں کی
زبانیں صرف اس غرض سے سیکھ رکھی تھیں، تاکہ ان سے براہ راست تبادلہ خیال کر کے
ان کے مسائل کو حل کیا جاسکے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ
کرام نے قرآن مجید کے بعض اجزا کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی کیا تھا، تاکہ عربی
زبان سے ناواقف لوگ اسلام کی حقیقی روح اور تعلیمات سے محروم نہ رہ جائیں۔ چنانچہ
علامہ سرحسیؒ (م ۴۹۰ھ) لکھتے ہیں:

بعض نو مسلم ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ کی
خدمت میں لکھا کہ ان کے لیے سورۃ الفاتحہ کو فارسی
میں نقل کر دیا جائے، چنانچہ وہ لوگ (اسی ترجمہ کو)
نماز میں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ وہ عربی سیکھ گئے۔

ان الفرس كتبوا الى سلمان ان يكتب لهم
الفاتحة بالفارسية، فكانوا يقرءون ذلك
في الصلوة حتى لانت ألسنتهم للعربية. ۴

اس واقعے کو ڈاکٹر حمید اللہؒ نے ’النهائية حاخمية الهداية‘ کے حوالے سے نقل کیا
ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ (م ۳۳ھ) نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے یہ کام انجام
دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جز بھی نقل کیا ہے، ”بنام خداوند بخشنا بدہ مہربان“۔ یہ بسم اللہ
کا ترجمہ ہے۔ ۵

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

اس کے علاوہ جن صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ نے مختلف قوموں کی طرف داعی اور مبلغ بنا کر روانہ فرمایا ان کے معاملے میں بھی یہ چیز آپ کی حکمت عملی کا حصہ نظر آتی ہے کہ وہ مبلغ اسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، بہ صورت دیگر وہ اس قوم کی زبان، رسم و رواج اور کلچر سے آگاہ ہوں۔

اسلام کی ترجیح - امن اور مکالمہ

سیرت طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو جنگ اور امن میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا موقع ملا تو آپ نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کے موقع پر آپ نے ایسی شرائط پر بھی صلح قبول کر لی جن سے بہ ظاہر مسلمانوں کی پسپائی کا تاثر ملتا تھا۔ اگرچہ ان شرائط کو قبول کرنے سے مسلمانوں کی دل شکنی ہوئی اور بعض صحابہ کو اس پر بڑا اضطراب بھی ہوا، لیکن آپ نے جنگ پر امن کو ترجیح دی، کیوں کہ آپ اپنے نور بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ امن کی صورت میں جب مسلمانوں اور مشرکوں کو آزادانہ ماحول میں میل جول کے مواقع حاصل ہوں گے تو قریش اور دیگر قبائل مسلمانوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب مسلمان اور قریش ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر ملنے لگے اور انہیں ایک دوسرے کے موقف کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا تو صرف دو سال کے عرصہ میں یعنی فتح مکہ ۸ھ تک اتنی بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے جتنے پہلے تمام عرصے میں نہیں ہوئے تھے۔ امام زہری (م ۱۲۵ھ) کا بیان ہے:

صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں اتنی بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جہاں بھی ملتے جنگ ہو کر رہتی تھی، لیکن جب صلح ہو گئی اور جنگ موقوف ہو گئی اور لوگ ایک دوسرے سے بے خوف ہو گئے، باہم ملے جلے، باتیں ہوئیں تو کوئی عقل مند ایسا نہیں تھا جس سے

فما فتح فی الاسلام فتح قبلہ کان
أعظم منه، انما کان القتال حیث التقی
الناس، فلما كانت الهدنة، ووضعت
الحرب و آمن الناس بعضهم بعضاً،
التقوا فتنافسوا فی الحدیث

المنازعة، فلم يكلم احد بالاسلام
يعقل شيئا الادخل فيه، ولقد دخل في
تينك السنيتين مثل من كان في
الاسلام قبل ذلك او اكثر. ۶

اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی اور اس نے اسے
قبول نہ کیا ہو۔ چنانچہ جتنے لوگ ابتداء سے
اب تک مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو
برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ
تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔

اسلام میں دعوت اصل ہے اور جہاد ضرورتاً فرض کیا گیا ہے۔ وہ صرف اسلامی
تہذیب و تمدن کے دفاع اور استحکام کے لیے ہے، اس لیے لامحالہ اسلام کی ترویج و اشاعت
کا تمام تر انحصار صرف دعوت و تبلیغ اور باہمی مکالمہ پر ہے، اس لئے ایک سچے داعی کی
حیثیت سے ہمارے لئے بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کرنا دین اسلام
کا بنیادی تقاضا بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ باہمی مکالمہ اور امن و امان کا
ماحول اسلام کی ضرورت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب بھی دلائل کی بنیاد پر گفتگو
ہوگی تو میدان ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے ہاتھ ہی رہے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى
وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ. (التوبة: ۳۳)

(وہ اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول
ﷺ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا
کہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے
خواہ مشرکوں کو کیسا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ اسلام کا غلبہ تمام ادیان
پر عقل و استدلال کی رؤ سے تو مطلق ہے اور وہ کسی زمانہ اور وقت کے ساتھ مخصوص نہیں،
البتہ مادی غلبہ اہل اسلام کی اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ آزادانہ
مباحثے اور مکالمے میں آخر کار جو چیز باقی رہے گی وہ سچائی ہے، جب کہ کامل اور بے داغ
سچائی اسلام کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ اسلام کے پاس طاغوت کو شکست
دینے کے لیے دلائل و براہین کی ہرگز کمی نہیں ہے اور مکالمے کی میز پر یہی ہمارا سب سے
بڑا ہتھیار ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

حقیقت یہ ہے کہ جب دلیل ہار جائے تو انسان اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتا ہے۔ تو بین آمیز خاکوں سمیت اہل مغرب کی اسلام کے خلاف موجودہ آویزش دراصل دلیل کی شکست کا اعتراف ہی تو ہے۔ اس وقت جب کہ مغرب دلیل کی زبان میں اسلام کا مقابلہ کرنے سے پہلو تہی کر رہا ہے اور اپنی برتر ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مسلمانوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں کرنا چاہتا ہے، مسلمان اہل دانش کا کام یہ ہے کہ وہ اہل مغرب کو مکالمے کی اس میز پر کھینچ لائیں جہاں انہیں مد مقابلہ پر فیصلہ کن برتری حاصل ہے، کیونکہ یہی وہ میدان ہے جس میں اسلام کی کامیابی کے امکانات سو فیصد ہیں، بشرطے کہ ہم اسلام کو صحیح طور پر اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس موقف کی ایک دلیل وہ مکالمہ بھی ہے جو نجران کے عیسائی علماء اور حضور ﷺ کے درمیان ہوا۔ جب عیسائی علماء آپ کے دلائل کے سامنے بالکل عاجز آ گئے تو انھوں نے جزیہ دینے کی شرط پر آپ سے صلح کر لی۔ عیسائی علماء کا دلیل اور استدلال کو چھوڑ کر جزیہ پر صلح کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس حقیقت کو جان چکے تھے کہ اسلام کا مقابلہ مکالمے اور استدلال کی زبان میں ممکن نہیں۔ اہل علم واقف ہیں کہ ولیم میور (م ۱۹۰۵ء) نے اپنی کتاب The Life of Muhammad میں رسول اللہ ﷺ کے مقام اور مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی تو علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) نے اپنے قلم کو جنبش دی، اپنے شعور کو مجتمع کیا اور اپنے فہم و ادراک کو کام میں لاتے ہوئے 'سیرت النبی ﷺ' جیسی معرکہ آرا کتاب سے مستشرق موصوف کا منہ بند کر دیا۔ دور حاضر میں 'ضیاء النبی ﷺ' کی صورت میں پیر محمد کرم شاہ الاذہری (م ۱۹۹۸ء) نے بھی یہی خدمت انجام دی ہے۔

عصر حاضر میں اسلام کا مکالمہ، لیکن کس مذاہب سے؟

اس وقت مختلف سطحوں پر بین المذاہب مکالمے کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ جون ۲۰۰۴ء میں اوسلو (ناروے) میں پہلی بین المذاہب کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ناروے کی حکومت اور وہاں کے چرچ کی دعوت پر مولانا محمد حنیف

جائندھری، مفتی منیب الرحمن، ریاض حسین نجفی اور بشپ سموئیل عزریاہ وغیرہ نے شرکت کی۔ عالمی سطح کی اس بین المذاہب کانفرنس میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے بین المذاہب ہم آہنگی اور محبت کی فضا کو فروغ دینے پر زور دیا۔ اعلانِ اوسلو کے تحت پاکستان میں بھی ورلڈ کونسل آف ریلیجنز برائے عالمی امن و عدل اجتماع کے زیر اہتمام ۱۶ ستمبر ۲۰۰۴ء کو نیشنل لائبریری ہال، اسلام آباد، میں پہلی بین المذاہب کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ مسلسل جاری و ساری ہے۔ یقیناً یہ ساری کوششیں لائقِ صد تحسین اور قابلِ قدر ہیں، لیکن اس ساری تگ و دو کے مثبت اور دور رس نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم بعض باتیں طے کر لیں۔ سب سے پہلی بات تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آج کی عالمی صورتِ حال میں اس مکالمے کے اصل فریق کون ہیں؟ اور دوسری یہ کہ اس مکالمے کا ایجنڈا کیا ہے؟ اس طرح ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ ہم علمی حلقوں میں اپنا موقف بہتر طور پر پیش کر سکیں۔

فی الوقتِ دنیا میں اسلام کے علاوہ عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت، جین مت وغیرہ ہی کو دنیا کے بڑے اور زندہ مذاہب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ وحی، الہام اور خدا پر یقین رکھنے والے زیادہ تر لوگوں کا تعلق انہی مذاہب سے ہے۔ اپنی غیر فطری اور غیر عقلی تعلیمات کی وجہ سے ان مذاہب کا ماضی میں بھی انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا ہے، لیکن عقل پرستی (Rationalism) کے موجودہ دور میں مذہب کا لوگوں کی ذاتی زندگی سے عمل دخل بھی بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور اس وقت عملی طور پر مسلمانوں کے علاوہ انسانوں کی غالب اکثریت لادین اور سیکولر ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کے بعد اس وقت بلا امتیاز رنگ و نسل پوری دنیا میں مغربی سیکولرزم مقبول ترین مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس وقت جب کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک تاریخی یادگار کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں، یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں مغربی فکر و فلسفہ کی بنیاد پر پروان چڑھنے والا سیکولرزم ہی اسلام کا اصل مدِّ مقابل ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

حالات کے سرسری جائزے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت مغرب اور مسلمانوں کے درمیان جو علمی، فکری اور تہذیبی کشمکش جاری ہے اس کے اصل فریق مغرب کے مذہب سے منحرف سیکولر حلقے اور مذہب پر پختہ یقین رکھنے والے مسلمان ہیں، جب کہ عیسائی علماء اس مکالمے کے اصل فریق نہیں ہیں، کیوں کہ مغرب کے عیسائی رہ نما جس مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا مغرب کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے موجودہ کشمکش میں عیسائی علماء سے مکالمہ کی افادیت محدود ہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود ہمیں عیسائیت اور دیگر مذاہب سے گفتگو اور مکالمے سے انکار نہیں ہے، تاہم روایتی عیسائی حلقے سے ہماری گفتگو اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ عیسائی مذہبی رہ نما اپنے معاشرے کو وحی الہی اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپس لانے کے لیے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ جب کہ وہ اصولی طور پر تسلیم کر چکے ہیں کہ مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت، جب کہ پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی بنی نوع انسان کو وحی الہی اور مذہب کی طرف واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ مغرب کے مذہبی حلقے اس سلسلے میں مسلمانوں کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کو اپنے عیسائی مخاطبین پر یہ حقیقت واضح کرنی چاہیے کہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، جو الحاد اور لادینیت کے خوف ناک طوفان کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس عالم گیر طوفان کے خلاف مسلمان، مسیحی اور دیگر مذہبی علماء ایک دوسرے کے فطری اتحادی ہیں۔ عیسائی علماء کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ واقعی وحی اور آسمانی تعلیمات کی صداقت پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور انسانی معاشرے پر اس کی علم برداری کے خواہش مند ہیں تو انہیں سیکولر حلقے کی تائید کے بجائے وحی اور آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

روایتی مذہبی حلقے سے مکالمے کے بنیادی اصول

بہ حیثیت مسلمان ہم پر لازم ہے کہ نسل انسانی کی فلاح اور بہتری کے لئے ہم مسیحیت کے ساتھ مکالمہ میں مشترک صفات پہ زور دیں۔ دین ابراہیمی کی مشترک

روایت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کا احترام اور ہمارے مشترک سماجی باندھن وغیرہ عیسائیت کے ساتھ مکالمے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف حکم رانوں کے نام آپ کے خطوط ہمارے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہرقل اور دیگر عیسائی حکم رانوں کو رسول اللہ ﷺ نے بذریعہ خطوط اسلام کی جو دعوت دی تھی، اس میں یہ آیت درج تھی: **قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُنْشِرِكَ بِهٖ شَيْئًا** (آل عمران: ۶۴) (آپؐ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسے قول کی طرف آ جاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں) اس آیت کا مکرر استعمال ہمارے لیے قابل توجہ ہے۔ اسی طرح مکاتیب نبوی لے جانے والے سفراء نے جس طرح اپنے مخاطبین سے مکالمہ کیا، وہ اسلوب بھی ہمارے لئے بین المذاہب مکالمے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ (م ۳۰ھ) کو شاہ مصر مقوقس کی طرف دعوتی خط دے کر روانہ فرمایا۔ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) نے حضرت حاطبؓ اور شاہ مصر کے درمیان ہونے والے مکالمے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب شاہ مصر نے حضرت حاطبؓ سے یہ کہا کہ اگر تمہارے صاحب اللہ کے رسول ہیں تو پھر انہوں نے اس وقت اپنی قوم کے خلاف بددعا کیوں نہ کی جب اس نے ان کو ان کے اپنے شہر سے نکالا؟ تو حضرت حاطبؓ نے فرمایا: عیسیٰ بن مریم کی نسبت آپ خود کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول تھے، پھر جب ان کو ان کی قوم نے سولی دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ان کو بددعا کیوں نہ دی؟ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا۔ مقوقس اس برجستہ جواب سے بڑا متاثر ہوا اور کہنے لگا:

احسنت! انت حکیم جاء من عند
حکیم . کے
تم نے اچھا جواب دیا، تم حکیم ہو اور حکیم
کے پاس سے آئے ہو۔

امام ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ) نے مقوقس اور حضرت حاطبؓ کے باہمی مکالمے کی جو روایت نقل کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

حاطبؓ: ”(اس زمین پر) تم سے پہلے ایک شخص (فرعون) گزرا ہے جو اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اللہ نے اسے آخرِ واؤل کے لیے عبرت بنادیا۔ پہلے تو اس کے ذریعے لوگوں سے انتقام لیا، پھر خود اس کو انتقام کا نشانہ بنایا، لہذا دوسروں سے عبرت پکڑو، ایسا نہ ہو کہ دوسرے تم سے عبرت پکڑیں۔“

مقوقس: ”ہمارا ایک دین ہے جسے ہم چھوڑ نہیں سکتے، جب تک کہ اس سے بہتر دین نہ مل جائے۔“

حاطبؓ: ہم تمہیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے تمام ماسوا (ادیان) کے بدلے کافی بنادیا ہے۔ دیکھو! اس نبی ﷺ نے لوگوں کو (اسلام کی) دعوت دی تو اس کے خلاف قریش سب سے زیادہ سخت ثابت ہوئے، یہود نے سب سے بڑھ کر دشمنی کی اور نصاریٰ سب سے زیادہ قریب رہے۔ میری جان کی قسم! جس طرح موسیٰؑ نے عیسیٰؑ کے لیے بشارت دی تھی، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے حضرت محمد ﷺ کے لیے بشارت دی ہے اور ہم تمہیں قرآن مجید کی دعوت اسی طرح دیتے ہیں جیسے تم اہل تورات کو انجیل کی دعوت دیتے ہو۔ جو نبی جس قوم کو پا جاتا ہے وہ قوم اس کی امت ہو جاتی ہے اور اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس نبی کی اطاعت کرے اور تم نے اس نبی کا عہد پالیا ہے، اور پھر ہم تمہیں دینِ مسیح سے روکتے نہیں ہیں، بلکہ ہم تو اسی کا حکم دیتے ہیں۔“

مقوقس: میں نے اس نبی ﷺ کے معاملہ پر غور کیا تو میں نے پایا کہ وہ کسی ناپسندیدہ بات کا حکم نہیں دیتے اور کسی پسندیدہ بات سے منع نہیں کرتے۔ وہ نہ گمراہ جادوگر ہیں نہ جھوٹے کاہن، بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان کے ساتھ نبوت کی یہ نشانی ہے کہ وہ پوشیدہ کونکا لتے ہیں اور سرگوشی کی خبر دیتے ہیں۔ میں مزید غور کروں گا۔^{۹۱}

حضرت حاطبؓ اور مقوقس کے اس مکالمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن اصحابؓ کو دوسری قوموں کی طرف دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا، ان کی تربیت کئی پہلوؤں سے کی۔ ایک پہلو یہ کہ جو صحابیؓ جس قوم کی طرف جائے اس کی زبان سے اچھی طرح واقف ہو، دوسرا یہ کہ اسے ان کے کچرا اور رسم و رواج سے بھی

واقفیت ہو، تیسرا یہ کہ وہ ان کے دین سے، جس کو وہ اختیار کیے ہوئے ہوں، آگاہ ہو اور چوتھا یہ کہ وہ اس سرزمین کے پورے جغرافیہ سے بھی مکمل واقفیت رکھتا ہو، تاکہ باہمی مکالمہ میں اسے ان معلومات کی بنا پر اپنے مخاطب پر علمی برتری حاصل رہے۔ یہاں اختصار کے پیش نظر محض ایک مثال پیش کی گئی ہے، اگر تمام نبوی سفراء کے احوال کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو بین المذاہب مکالمے کے لئے کئی راہ نما اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ۹۔ اہل مغرب کے تحفظات پر مکالمے کا اسلوب

جو لوگ خدا، رسول اور آخرت پر اعتقاد رکھتے ہوں ان کے ساتھ مکالمہ نسبتاً آسان ہے، اگرچہ اہل مغرب کا اب بھی چرچ کے ساتھ کم زور سا تعلق باقی ہے، لیکن ان کی اکثریت بالخصوص اہل یورپ عیسائیت کی بنیادی تعلیمات سے دست بردار ہو چکے ہیں، اس لئے مسلمان مبلغین کو مغرب میں تمام خرابیوں کی ذمہ داری عیسائیت کے سر نہیں ڈال دینی چاہیے، بلکہ ان کے ساتھ مکالمے میں ان کے موجودہ نظریات ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیے، جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ موجودہ علمی اور فکری کشمکش میں اسلام کے ساتھ مکالمے کا اصل فریق اور مد مقابل مغرب کا موجودہ دانش ور اور سیکولر طبقہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارا مکالمہ اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب ہم مغربی فکر و فلسفہ کے تاریخی ارتقاء، پس منظر اور اس کے اصل فکری سرچشموں سے آگاہی رکھتے ہوں اور ہم میں مغربی افکار کا تنقیدی جائزہ لینے کی صلاحیت ہو۔ اس حوالے سے جن پہلوؤں پر خصوصی غور و فکر کی ضرورت ہے وہ درج ذیل ہیں:

ایک تو اس پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مغرب مسیحیت کو چھوڑ کر موجودہ سیکولرزم تک کیوں اور کیسے پہنچا؟ ہمارے لئے اس تاریخی حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ سولہویں صدی عیسوی تک مغرب میں قدیم عیسائیت ہی غالب تھی، طاقت اور اختیار پوپ کے ہاتھ میں تھا۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) (م ۱۵۳۶ء) پہلا شخص تھا جس نے پوپ کے اختیار کو چیلنج کیا اور ساتھ ہی عقل انسانی کو وحی کی تعبیر کا واحد ذریعہ قرار دیا۔

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

یہی وہ دور ہے جس کے بعد مغربی معاشرے پر عیسائیت کی گرفت آہستہ آہستہ کم زور پڑنے لگی، لیکن جس فکر نے بالآخر عیسائیت کو مکمل پسپائی اور شکست پر مجبور کیا وہ اٹھارویں صدی عیسوی میں پروان چڑھنے والی تحریک تنویر (Enlightenment Movement) اور تحریک رومانیت (Romanticism) ہے۔ مغرب کی موجودہ روشن خیالی کی تحریک کا یہ وہ مختصر پس منظر ہے جس کا پوری تفصیل کے ساتھ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا پہلو جس کا جائزہ لینا ضروری ہے وہ تحریک استشرق (Orientalism) ہے۔ اہل مغرب میں اسلام کے بارے میں پائی جانے والی ان بے شمار غلط فہمیوں کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک تحریک استشرق کے مقاصد، محرکات اور عالم مغرب پر اس کے اثرات کا بھرپور تجزیہ نہ کر لیں۔ بد قسمتی سے مستشرقین کی مرتب کردہ تاریخ نہ صرف زندہ ہے، بلکہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت بھی پوری دنیا میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اسلام کی جو تصویر کشی کی جا رہی ہے اس کا بڑا مآخذ مستشرقین کی وہی تحقیقات ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مغرب کے ساتھ باہمی مکالمہ کی صورت میں تیسری بات جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن و حدیث سے رہ نمائی تو ضرور لینا چاہیے، تاہم مغرب کی نفسیات کے مطابق ہمیں سب سے پہلے اسلامی تعلیمات کے عقلی جواز پر بات کرنی ہوگی اور مغرب کے موجودہ سماجی علوم اور اسلام کے تقابلی مطالعہ کے بعد اسلامی احکام کی افادیت پر دلائل پیش کرنے ہوں گے اور اسلامی تعلیمات کی سماجی اور معاشرتی اہمیت واضح کرنی ہوگی۔ اسلامی احکام کے اسرار و حکم پر حضرت شاہ ولی اللہ (۶۱۷ھ) کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' بڑی ہی قابل قدر ہے۔ موجودہ حالات کے پس منظر ہی اس موضوع کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مغربی اقدار اور اہل مغرب کے تحفظات

مغرب اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تحفظات رکھتا ہے وہ دو قسم کے

ہیں۔ پہلی قسم کے تحفظات تو وہ ہیں جن کا تعلق اسلامی تاریخ اور نظام معاشرت سے ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہ وہ حصہ ہے جس کا براہ راست ٹکراؤ مغرب کے موجودہ طرز معاشرت سے ہے۔ دوسری قسم کے تحفظات وہ ہیں جن کا تعلق دین کی اساس اور بنیاد سے ہے۔ مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک ہم کھلے ذہن اور مکمل تیاری کے ساتھ ان کے تمام تحفظات پر بات کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ سب سے پہلے ہمیں مغرب سے اس موضوع پر مکالمہ کرنا ہوگا کہ وہ دین اسلام پر ایک نظام حیات اور طرز معاشرت کی حیثیت سے غور کرے۔

انسانی حقوق اور اسلام

اس وقت مغرب میں مساوات، آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کے سلسلے میں بڑی حساسیت پائی جاتی ہے۔ بد قسمتی سے اسلام کے بارے میں یہ غلط تاثر پھیلایا گیا ہے کہ اسلام میں بنیادی انسانی حقوق اور خاص طور پر عورتوں کے حقوق کو بری طرح پامال کیا گیا ہے۔ ہمیں اہل مغرب پر واضح کرنا ہوگا کہ اسلام تمام انسانی حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور اس کے عطا کردہ حقوق ہی فطری بنیادوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً جب اسلام ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے تو کیا یہ حرمت انسان کا بہترین قانون قرار نہیں پائے گا؟ اسی طرح اسلام کی بیان کردہ تمام سزائیں بھی انسانی حق کے اثبات ہی کے لیے ہیں۔ عورتوں کے حقوق میں بھی ان کے فطری دائرہ کار اور نفسیات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

ایک داعی کی حیثیت سے جو بات ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے وہ یہ کہ اگرچہ انسانی حقوق کے عالمی منشور، (Universal Declaration of Human Rights) جو بجا طور پر آج کا عالمی قانون ہے، کی تمام شقوق کو قبول کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، تاہم ہمیں اس بحث میں زیادہ مثبت اور تعمیری انداز میں حصہ لینا چاہیے اور اگر باہمی مکالمہ میں کسی جگہ لچک کی گنجائش موجود ہو تو اس کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے سیرت طیبہ ﷺ سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے بین الاقوامی قانون، عرف اور قبائلی رسم و رواج کا احترام کیا۔ مثلاً جب آپؐ کا مسیلہ کذاب کے سفیروں سے مکالمہ ہوا تو آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مسیلہ کو نبی مانتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کروا دیتا۔ اِدیکھئے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، لیکن آپؐ نے ان پر یہ حد جاری نہیں کی، بلکہ فرمایا کہ چونکہ عالمی قانون یہ ہے کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا، اس لیے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں، ورنہ میں تمہیں قتل کروا دیتا۔

سن ۹ ہجری میں اقرع بن حابسؓ کی زیر قیادت بنو تمیم کا وفد اسلام قبول کرنے کے لیے بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا، لیکن ان لوگوں نے قبول اسلام کے لیے بڑی عجیب شرط لگائی کہ آپؐ پہلے ہمارے ساتھ مفاخرت کریں، آپؐ کا خطیب ہمارے خطیب کا اور آپؐ کا شاعر ہمارے شاعر کا مقابلہ کرے، تب ہم اسلام قبول کریں گے۔ آپؐ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول کیا۔ چنانچہ آپؐ کے حکم پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے ان کے شاعر زبرقان بن بدر کا مقابلہ کیا اور حضرت ثابت بن قیسؓ نے ان کے خطیب عطار بن حاجب کا مقابلہ کیا۔ بنو تمیم نے بالآخر حضور ﷺ کے شاعر اور خطیب کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ ۱۱

دیکھا جائے تو وفد بنی تمیم کا مطالبہ بالکل لالچینی تھا۔ بالفرض اگر مسلمانوں کا شاعر اور خطیب مقابلے میں شکست کھا بھی جاتے تو بھی اسلام کی حقانیت پر کوئی اثر نہ پڑتا، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے ان کے رسم و رواج کا احترام کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسری قوموں کے ساتھ مکالمے کی اتنی زبردست تیاری کر رکھی تھی کہ بنو تمیم نے جب قبول اسلام کی یہ عجیب و غریب شرط رکھی تو آپؐ نے بلا جھجک ان میدانوں میں ماہر اپنے اصحاب کو طلب کیا۔ اسی طرح جب آپؐ نے مختلف حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کرنے چاہیے تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! حکمرانوں میں یہ اصول ہے کہ وہ ان خطوط پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے

جن پر کوئی مہر (Seal) وغیرہ نہ ہو، چنانچہ اسی وقت آپؐ نے خطوط کو مہر بند کرنے کے لیے مہر بنانے کا حکم دیا۔ ۱۲

رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے کردار سے کون واقف نہیں؟ اس کی شرائط کی وجہ سے اسلام کوئی دفعہ نقصان اٹھانا پڑا۔ صحابہ کرامؓ نے بارہا اس کے قتل کا ارادہ کیا، حتیٰ کہ ایک دفعہ خود اس کے صاحب زادے، جو مخلص مومن تھے، نے بھی آپؐ سے اپنے باپ کے قتل کی اجازت طلب کی، لیکن آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو ایسے کسی بھی عمل سے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور فرمایا کہ میں اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ یہ کہیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کے قتل کا حکم دیتے ہیں۔ اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو عبد اللہ بن ابی سخت ترین سزا کا مستحق تھا لیکن آپؐ نے پھر بھی اس سے درگزر فرمایا، صرف اس وجہ سے کہ کہیں عام لوگوں کے ذہن میں اسلام کے بارے میں کوئی منفی تاثر پیدا نہ ہو جائے، گویا آپؐ کی نظر اصولی حکم کے نفاذ کے علاوہ اس کے نتائج اور عملی اثرات پر بھی تھی۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک داعی کے لیے نہ صرف عالمی قانون، رسم و رواج اور عرف سے واقفیت ضروری ہے، بلکہ اگر دعوت اور مکالمہ کے مثبت نتائج کی توقع ہو تو دیگر اقوام کے قوانین اور رسم و رواج کا ممکن حد تک لحاظ اور احترام بھی کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر کسی اسلامی حکم کا نفاذ وقتی مصلحت کے خلاف ہو تو اس کے نفاذ میں توقف کیا جاسکتا ہے۔ عصر حاضر میں مسلمان قانون دانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کا سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں مطالعہ کریں اور ان پہلوؤں کا جائزہ لیں جہاں باہمی گفتگو اور مکالمہ میں چپک کے پہلو کو مد نظر رکھا جاسکتا ہے۔

اسلام کا تصور جہاد

اسلام کے بارے میں اہل مغرب کو جو غلط فہمیاں ہیں ان میں سے ایک اس کا تصور جہاد ہے۔ مدنی دور میں رسول اللہ ﷺ نے چھوٹی بڑی تقریباً ستاسی (۸۷) مہمات ترتیب دیں۔ ان تمام مہمات کے مقاصد، محرکات اور اہداف مختلف تھے۔ ان میں سے بعض انسدادی نوعیت کی تھیں تو بعض دفاعی تھیں، جب کہ بعض خالص دعوتی اور تبلیغی

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

نوعیت کی تھیں، لیکن محدثین اور مسلمان سیرت نگاروں نے ان تمام مہمات کو، جن میں ترتیب اور تنظیم کا معمولی سا بھی خیال رکھا گیا تھا، کتاب المغازی اور غزوات و سرایا کے عنوان سے ذکر کر دیا، جس سے اس غلط پروپیگنڈا نے جڑ پکڑی کہ اسلام جنگ و جدال کا دین ہے۔ مغرب میں یہ تاثر عام ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے اور اگر اب بھی مسلمانوں کو موقع ملا تو وہ بہ زور شمشیر اسلام کو تمام دنیا پر غالب کر کے دم لیں گے۔

اسلام کے تصورِ جہاد کے حوالے سے اہل مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ دو پہلوؤں سے ہونا چاہیے، پہلی بات تو ہمیں یہ واضح کرنا ہوگی کہ ابتدائی ایک دو صدیوں میں اسلام کے اسپین، وسطی ایشیا اور برصغیر تک پھیلنے کی بڑی وجہ اسلامی تعلیمات کی معقولیت اور مسلمان مبلغین کی انتھک کوششیں ہیں۔ دنیا کے کتنے ہی علاقے ایسے ہیں جہاں اسلامی فوجوں کا کبھی داخلہ نہیں ہوا، لیکن اسلام وہاں بھی موجود ہے۔ انڈونیشیا اور ملیشیا پر بھلا کون سی اسلامی فوجیں حملہ آور ہوئی تھیں؟ لیکن کیا وہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں؟ اس لیے تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں اسلام کو دوسری اقوام پر ٹھونسنے کے لیے تلوار سے مدد لی گئی ہے۔

اس موضوع پر پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ کی کتاب The Preaching of Islam ہمارے لیے بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بد قسمتی سے جہاد کے بارے میں ہم اسلامی نقطہ نظر کو اہل مغرب پر پوری طرح واضح نہیں کر سکے۔ عام لوگ اب بھی اسی پرانی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمیں اہل مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام کے پھیلنے کے اسباب دیگر ہی ہیں۔ مثلاً ہمیں دلائل کے ساتھ بتانا ہوگا کہ بہت سے عیسائی، جن سے ابتدائی دور میں اسلام کا مکالمہ ہوا وہ بھی مسلمانوں کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے عقائد کی یکسانیت ابتدائی دور کے مسیحیوں کے قبول اسلام کا بڑا سبب بنی ہے، ڈاکٹر حمید اللہ^۲ (م ۲۰۰۲ء) لکھتے ہیں:

”نجاتی فرقہ طہیعت واحد کا (یعنی مانو فرائٹ) عیسائی تھا۔ اور ان دنوں

اس فرقے اور یونان کے عیسائیوں میں بڑے سخت اختلافات تھے، آخر

الذکر اس بات کے قائل تھے کہ حضرت عیسیٰ میں بہ وقت واحد دو طبیعتیں تھیں، انسانی اور خدائی بھی۔ ابرہہ جو (یمن میں) نجاشی کا نائب تھا، حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ نہیں بلکہ صرف مسیح اللہ مانتا تھا۔ غالباً نجاشی کے بھی یہی عقائد ہوں گے اور یہ مسلمانوں کے عقائد کے بہت مماثل ہیں۔

اسی طرح روم اور ایران کے لوگوں نے قیصر و کسریٰ کی نسبت مسلمانوں کے عادلانہ اور سماجی مساوات پر مبنی انداز حکم رانی اور مناسب اور قانونی ٹیکسوں کے نفاذ کو خوش آمدید کہا اور یہی چیز ان کے قبول اسلام کا بنیادی سبب بنی۔

دوسرے ہمیں اہل مغرب کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ جنگ انسانی نفسیات کا لازمی جزو ہے۔ اس لیے دنیا کی ہر تہذیب میں جنگ بہ ہر طور موجود رہی ہے۔ اہل مغرب، جو اس وقت امن کے سب سے بڑے داعی ہیں، ان کا موجودہ رویہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ اسلام نے انسانی نفسیات کے اس پہلو سے آنکھیں بند نہیں کیں، بلکہ انسان کے جنگی جنون کی تہذیب و تطہیر کر کے اس کو جہاد کے روپ میں پیش کیا ہے۔

اسلامی دنیا میں مذہبی تکشریت کا وجود

اہل مغرب میں اسلام کے بارے میں غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اقلیتوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس لئے مغرب سے مکالمہ میں اس نکتہ کو اجاگر کرنا ضروری ہے کہ عہد رسالت ﷺ اور اس کے بعد کی اسلامی دنیا بالخصوص مصر، لبنان، ہندوستان اور عثمانی ترکوں کے دور میں ہمیشہ قرآنی اصول کے مطابق لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔ اسلامی دنیا میں مذہبی تکشریت کا وجود ہمارے موقف کی واضح شہادت مہیا کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید کی اصولی تعلیم: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرة: ۲۵۶) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) کی نظری اور عملی تبلیغ اور اشاعت کی جائے۔ اس کے علاوہ عہد رسالت ﷺ، عہد خلافت راشدہ اور مسلم عروج کے ان تاریخی معاہدات سے بھی استشہاد کیا جاسکتا ہے، جن میں مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

خلافت اور جمہوریت

اسلام کے سلسلے میں مغرب میں ایک اور غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اگر مسلمان اقتدار میں آگئے تو وہ پوری دنیا میں خلافت کا نظام نافذ کریں گے اور لوگوں کی شخصی آزادیاں اور حقوق سلب کر لیں گے۔ اسلامی نظام خلافت کے خلاف اہل مغرب کی اس غلط فہمی کی اصل وجہ اور پس منظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ مغرب کا وہ دور ہے جسے قرون مظلمہ (Dark Ages) کہا جاتا ہے، جس میں پوپ ہی طاقت کا اصل سرچشمہ اور فائنل اتھارٹی (Final Authority) تھا۔ پوپ نے ہمیشہ ارباب حل و عقد کا ساتھ دیا اور حکمرانوں کو مذہبی تحفظ فراہم کیا، دوسری طرف عوام کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ اصل میں مغرب نے اسلام کے نظام خلافت کو بھی یورپ کے دور تاریک میں اپنے ہاں پائی جانے والی مذہبی حکومتوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ مغرب نے صدیوں کی کشمکش کے بعد جو سیاسی اور شخصی آزادی حاصل کی ہے وہ اب اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم مغرب پر یہ بات واضح کریں کہ اسلام کے تصور خلافت کو پاپائیت سے کوئی نسبت نہیں، کیوں کہ مسلمانوں کا خلیفہ عیسائیوں کے پوپ کی طرح خدا کا نمائندہ نہیں ہے، جس کی کسی بات کو نہ چیلنج کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ کسی اصول کا پابند ہے۔ ایک دفعہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ (م ۱۳ھ) کو ایک شخص نے 'یا خلیفۃ اللہ' (اے اللہ کے خلیفہ) کہا تو آپؐ نے فوراً اس کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں، بلکہ اس کے رسول ﷺ کا خلیفہ ہوں۔ ۱۳ پوپ کے برعکس مسلمانوں کا خلیفہ خدا کے بجائے رسول اللہ ﷺ کا نمائندہ ہے، جو مطلق العنان نہیں، بلکہ اصول کا پابند ہوتا ہے، جس سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور جو ایک خاص دائرے میں رہ کر ہی اپنے فرائض منصبی ادا کر سکتا ہے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ خلفاء راشدین سے عام مسلمانوں نے نہ صرف اختلاف کیا، بلکہ بسا اوقات ان کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور

بھی کیا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) نے جب مسلمان عورتوں کے لئے مہر کی ایک خاص مقدار مقرر کرنا چاہی تو ایک خاتون نے ان کو برسرِ منبر ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔ ۱۴

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان علماء نے ہمیشہ دلیل اور حق کا ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ عوام کے شانہ بہ شانہ مذہبی اور سیاسی حقوق کی جنگ لڑی ہے۔ پوری اسلامی تاریخ اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) اور کتنے ہی جلیل القدر ائمہ نے وقت کے حکمرانوں کو چیلنج کیا اور اپنی جانوں تک کی پروا نہ کی۔ ہمیں مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ ہمارا ماضی ان کے ماضی سے بالکل مختلف ہے، اس لئے مغرب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا تاریک ماضی دکھا کر ہمیں ہمارے روشن ماضی سے محروم کر دے۔

اگر ہم اہل مغرب کو اس بات پر قائل کر لیں کہ اسلام کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام انسانی سوسائٹی کے لیے زیادہ مفید اور بہتر ہے تو پھر شاید ہمارے لئے ان کے ان تحفظات کو دور کرنا مشکل نہیں ہوگا جن کا تعلق دین اور مذہب کی اساس سے ہے۔ اہل مغرب کے وہ تحفظات جن کا تعلق اسلام کے بنیادی اور اساسی تصورات سے ہے وہ درج ذیل ہیں:

خدا کے وجود کا اثبات

یہاں بھی ہمیں اہل مغرب سے مکالمہ کرتے وقت اس ماحول کو پیش نظر رکھنا ہوگا جس میں مغربی ذہن پر وان چڑھتا اور شعور کی منازل طے کرتا ہے۔ اہل مغرب، جو ہر چیز کو عقل (Reason) کی بنیاد پر پرکھنے کے عادی ہیں، ان کے سامنے خدائی کتاب کی بنیاد پر اپنے دلائل شروع کرنے سے پہلے خود خدا کے وجود کو زیر بحث لانا ہوگا، ورنہ مغرب کی خطرناک حد تک آزاد سوچ ہمیں غیر سنجیدہ قرار دے گی۔ سائنسی امکان اور عقل کی بنیاد پر اگر خدا کے وجود کے لیے فطرت کے مشاہدے پر زور دیا جائے تو

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

شاید ہمیں کامیابی حاصل ہو، جیسا کہ مکی عہد نبوت میں رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کو عقل اور مشاہدہ فطرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف متوجہ کیا تھا۔

کیا اسلام عیسائیت اور یہودیت کی نئی صورت گری ہے؟

مغرب میں اسلام کے بارے میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص کے ذہن میں بھی یہ تصور راسخ ہے کہ اسلام کوئی مستقل دین نہیں، بلکہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا نیا روپ ہے۔ اس خیال کی ترویج میں بنیادی کردار تحریک استشرق کا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور عیسائی عالم یوحنا دمشق (John of Damascus) کو تحریک استشرق کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے 'محادرة مع المسلم' اور 'ارشادات النصاری فی جدل المسلمین' نامی کتب سے اسلام کے خلاف جس منفی پروپیگنڈے اور قلمی مناظرے کا آغاز کیا تھا، مغرب میں اس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اپنی قابل قدر تصنیف 'ضیاء النبی ﷺ' کی چھٹی اور ساتویں جلد میں تحریک استشرق کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اہل مغرب، جو سماجی، معاشرتی اور سائنسی علوم کی معراج کو پہنچے ہوئے ہیں، ان کے نزدیک آج بھی اسلام کے بارے میں نہ جاننا کم علمی کی دلیل نہیں ہے۔ مغرب میں یہ تاثر اب بھی عام ہے کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت ہی کی مسخ شدہ تعلیمات پر مبنی ہے اور اسلامی قوانین یہودیوں کی فقہ تالمود سے اخذ شدہ ہیں، جن کا زیادہ زور ان کے ظاہری الفاظ پر ہے نہ کہ مقاصد پر۔ جوزف شاخت (Josefh Schacht) نے اپنی کتاب 'The origins of Muhammadan Jurisprudence' میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے۔ مشہور مستشرق ول ڈیورانٹ (Will Durant) (م ۱۹۸۱ء) نے اپنی کتاب 'The Age of Faith' میں، فلپ کے ہٹی (Philip K. Hitti) نے اپنی کتاب 'Islam and the West' میں اور مورلیس سیل (Morris S. Seale) نے اپنی کتاب 'Muslim Theology' میں دعویٰ کیا ہے کہ قرآن وحدیث کا بڑا حصہ یہودی اور عیسائی روایات

سے ماخوذ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے تقابلی مطالعہ سے اہل مغرب کی اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔

قرآن وحی الہی ہے

رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے انکار کی وجہ سے مغرب میں قرآن کو آسمانی صحیفہ کے بجائے محمد ﷺ کی ذاتی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ بھی ماضی کا پروپیگنڈا ہے جس کو زائل کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ گزشتہ کئی صدیوں سے کئی یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، لیکن ان تراجم کے اسلوب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان مترجمین کے پیش نظر اسلام کا تعارف کرانے کی نسبت مسیحی جنگ جوؤں کو مقدس جنگ (Sacred War) کے لیے مسلمانوں کے خلاف تیار کرنا تھا۔ بعد کے دور میں قرآن مجید کے تراجم میں یہی اسلوب کسی نہ کسی انداز میں غالب رہا ہے۔ اسی پروپیگنڈے کے زیر اثر مسلمانوں کو محمدن (Muammadan) پکارا گیا اور اسی سے محمدن لا (Muhammadan Law) کی اصطلاح وجود میں آئی۔

قرآن مجید ہر دور کے لیے نبی کریم ﷺ کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔ عہد رسالت میں بھی لوگوں نے قرآن مجید کو جب حضور ﷺ کی اختراع قرار دیا تو آپ نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت، اس کے اسلوب بیان اور ہر قسم کے تناقض سے مبرا ہونے کو اس کے کلام الہی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ عقل پرستی کے موجودہ دور میں قرآن مجید کا معجزانہ پہلو اس کی فطری تعلیمات کے علاوہ وہ سائنسی اور تاریخی حقائق ہیں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس پہلو پر توجہ دیں اور اہل مغرب کو یہ بتائیں کہ کتنے ہی ایسے تاریخی اور سائنسی حقائق ہیں جن تک مغرب صدیوں کی محنت اور تجربات کے بعد پہنچا ہے، لیکن قرآن مجید نے صدیوں پہلے ان حقائق کو بیان کر دیا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کسی انسان کا نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ ڈاکٹر مورلیس بوکائے کی کتاب The Bible, The Quran and Science

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

اور اس کے بعد اس موضوع پر شائع ہونے والی دیگر کتب اس ذیل میں ہماری توجہ کی خصوصی مستحق ہیں۔

اہل مغرب میں اعلیٰ ترین سطح پر اب یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ مذہب سے مکمل دست برداری ان کے معاشرتی اور تہذیبی زوال کا باعث بن رہی ہے اور موجودہ مغربی فلسفہ ان کے تمام مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس وقت اہل مغرب جو روحانی خلا محسوس کر رہے ہیں اس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فی الوقت مغربی سیکولرزم کو ایک خاص مفہوم میں بحران کا سامنا ہے۔ آج کی عالمی صورت حال میں مذہب ایک بار پھر اہل مغرب کی زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو رہا ہے۔ ۱۵ اس لیے مسلمان اہل علم کے لیے یہ مناسب وقت ہے کہ وہ اہل مغرب کے سامنے اسلام کو بہتر انداز میں پیش کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مغرب کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلام کو آج کے جدید اسلوب، تکنیک اور زبان میں پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اپنی فطری تعلیمات کی وجہ سے مغرب کے اعلیٰ ذہن کو متاثر نہ کرے۔

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے رجال کار کی تیاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چوں کہ اسلام کی اشاعت کا تمام انحصار دعوت و تبلیغ اور دوسری قوموں سے مکالمے پر ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف بین المذاہب مکالمے کی عملی مثال قائم کی، بلکہ ایسے افراد بھی تیار کیے جو دوسری قوموں سے مکالمے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ اب جب کہ حالات کے جبر نے ہمیں بین المذاہب مکالمے کی میز پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے، ہمارے پاس ایسے افراد کی شدید کمی ہے جو مغربی فکر و فلسفہ پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہوں اور جو اہل مغرب کی ذہنی ساخت، ان کی نفسیات، پس منظر اور تکنیک سے واقف ہوں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ علمی رسوخ رکھتے ہیں وہ مغربی زبان و ادب اور مغرب کی نفسیات سے واقف نہیں اور جو لوگ مغربی زبان اور محاورے کو جانتے ہیں وہ علمی طور پر کم زور ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس اور جامعات کے نصاب تعلیم میں مغربی

فکر و فلسفہ کو بہ طور لازمی مضمون کے شامل نصاب کیا جائے، تاکہ ایسے رجالِ کار کی تیاری ممکن ہو جو مغرب کے دانش ور طبقے سے پورے اعتماد کے ساتھ بات کر سکیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یونانی فکر و فلسفہ کے عروج کے دور میں مسلمان اہل علم نے یونانی علم کلام اور فلسفہ پر مکمل عبور حاصل کیا تھا اور پھر یونانی فکر و فلسفہ کے علمی اور تخلیقی جائزے کے بعد اسلامی فکر کی برتری کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا تھا۔ دورِ حاضر میں مسلمان اہل علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی تاریخ کو دہراتے ہوئے جدید علم کلام اور مغربی فکر و فلسفہ پر عبور حاصل کریں، تاکہ مغربی فکر کا بھرپور تنقیدی جائزہ لے کر اس کی کم زوریوں اور کھوکھلے پن کو واضح کیا جاسکے۔

ایک اور چیز جس کا ہمیں خاص طور سے لحاظ رکھنا چاہیے وہ یہ کہ مغرب کے ساتھ مکالمہ میں ہمارا رویہ معذرت خواہانہ اور دفاعی کے بجائے اقدامی ہونا چاہیے۔ ہمیں اسلام کے بنیادی عقائد اور نظریات کی ایسی تاویل سے اجتناب کرنا چاہیے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو۔ معروف روایت کے مطابق جب قریشی وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سامنے مختلف متبادل (Options) رکھے کہ آپ جو پیش کش بھی چاہیں قبول کر لیں، مگر دعوت و تبلیغ سے باز آجائیں تو آپ نے اس وقت جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے وہ ذہنی مرعوبیت کے شکار لوگوں کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا: ”اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اپنے مشن سے پیچھے ہٹنے والا نہیں“۔ اسی طرح جب شاہِ حبشہ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا، تاکہ وہ حضرت عیسیٰ اور عیسائی مذہب کے بارے میں اپنا موقف بیان کریں، تو مسلمانوں سخت پریشان ہوئے، کیوں کہ سچ کہنے کی صورت میں نجاشی اور درباریوں کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا، لیکن آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت کے بعد یہ متفقہ فیصلہ کیا:

نقول واللہ ما قال اللہ و ما جاء نابہ اللہ کی قسم، ہم وہی کہیں گے جو اللہ نے فرمایا
 اور رسول اللہ ﷺ نے جس کی تعلیم دی ہے۔ نبینا۔ ۷

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

اس لیے ہمیں کسی قسم کی ذہنی مرعوبیت کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام ہی ایک ایسا تریاق ہے جو مغرب کی تہذیب کو ہر قسم کے نقائص سے پاک کر کے زندہ جاوید کر سکتا ہے۔ مغرب کے تمام مسائل، خاندانی نظام کی شیرازہ بندی، بچوں میں بڑوں کا احترام پیدا کرنا، باہمی اخوت، نسلی تفاخر کا خاتمہ، نفسیاتی استحکام، احترام آدمیت، تحمل، ایڈز جیسی بیماریوں کے خلاف سماجی مدافعت وغیرہ کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔

حواشی و مراجع

- ۱۔ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۹۱/۴
- ۲۔ مسند احمد، حدیث زید بن ثابتؓ، ۱۱۰۸، ۶/۲۳۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۱ء
- ۳۔ سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب من اٰحق بالولد، ۲۲۷
- ۴۔ سرخسی، المبسوط، کتاب الصلوٰۃ، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۸ء، ۳۷/۱
- ۵۔ ڈاکٹر حمید اللہ، صحیفہ ہمام بن منبہ، ناشر رشید اللہ یعقوب، کلفٹن، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۳
- ۶۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵ء، ۳۵۱/۳

یہاں ضمناً ایک اور بات کا ذہن نشین رہنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں اسلام کی امن پسندی پر استدلال کے لئے صلح حدیبیہ کا حوالہ جس انداز سے دیا جاتا ہے اس سے اس عظیم تاریخی واقعے کی حیثیت محض ایک منفی سمجھوتے کی سی ہو کر رہ جاتی ہے، حالاں کہ کوئی بھی تاریخی واقعہ یک دم وقوع پذیر نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کو بھی اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۶ھ سے قبل کے واقعات اسلام کے متعلق ہر قسم کے مفعولی تاثر کو ختم کر چکے تھے۔ اس پس منظر میں صلح کا معاہدہ مسلمانوں سے زیادہ خود قریش کی ضرورت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خون عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں سے مشہور بیعت، بیعت رضوانؓ لی اور مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو گئے تو قریش نے عافیت اسی میں جانی کہ صلح کے موقع کو ضائع نہ کیا جائے۔ تاہم آپؐ نے جن شرائط پر صلح کی اس سے آپؐ کی امن پسندی کا واضح

ثبوت ملتا ہے۔

- ۷ ابن الاثیر الجزری، اسد الغابۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۳۶۲/۱
- ۸ ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹ء، ۳/۶۹۱، ۶۹۲
- ۹ اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو: صحابہ کرام کا اسلوب دعوت و تبلیغ، ناشر، مکتبہ جمال کرم، لاہور، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۱۷۷-۱۸۷
- ۱۰ مسند احمد، ۱/۶۵۴، ج: ۳۷۵۲، حدیث عبداللہ بن مسعود
- ۱۱ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲۳۲/۱، ذکر نقش خاتم رسول اللہ ﷺ
- ۱۲ ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۷
- ۱۳ ابویعلیٰ، الاحکام السلطانیہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۳ء، ص: ۷۷
- ۱۴ ابن العربی، احکام القرآن، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ۳/۶۹۱، تفسیر آیت: وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا (النساء: ۲۰)
- ۱۵ اس حوالے سے پروفیسر میاں انعام الرحمن کا تجزیاتی مضمون جو ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ، اگست ۲۰۰۵ء میں ”مغرب کی ابھرتی ہوئی مذہبی شناخت“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے، قابل مطالعہ ہے۔
- ۱۶ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۳/۶۶۷
- ۱۷ سیرت ابن ہشام، ۱/۳۷۳



پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقات اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الہی صاحب، 27-A، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>